تعلیم وتربیت میں ہم آہنگی

(تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں)

حافظ عبدالباسط خان*

تعلیم وتربیت۔۔۔بنیادی نظریات:

علم کے بارے میں بنیادی طور پر دو نظریات رہے ہیں۔ایک نظریہ کے مطابق تعلیم کا مقصد معاشرے کا تحفظ ہے اور دوسرے نظریہ کے مطابق گیان اور دھیان ہے۔گویا تعلیم یا تو علم خالص کی جستجو کا نام ہے یا پھر تعلیم کسی ایسی کارآمد چیز کا نام ہے جو معاشرے کی اصلاح وتحفظ کر سکے۔مقدم الذکر فلسفہ کی ترویج پانچویں صدی ق۔م سے زیادہ ہوگئی۔افلاطون کا سیکولر تعلیمی فلسفہ سولہویں صدی عیسوی تک راج کرتا رہا ہے۔ پھر تحریک نشأۃ ثانیہ کے بعد جان لوک کی جاننے کی تھیوری (EPISTEMOLOGY) میں امپریسزم (IMPERICISM)، روسو کی علم کی تھیوری میں تین عناصر (عمل کے نتائج کا مشاہدتی تجربہ، دل کی پسند اور عملی طور پر فائدہ) اور بالآخر شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے خلاف فرد اور سماج کے درمیان بیک وقت تضاد اور ربط پر مشتمل رشتہ اور اس پر مبنی رومانویت (ROMANTICISM)، فلسفہ تعلیم کے وہ قدیمی اور روایتی مباحث ہیں جو وحی کی بجائے وجدان، حواس اور تجربہ وغیرہ کو علم کا قطعی ذریعہ سمجھنے کے باعث مذہب دشمن ہونے میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

پھر جون ڈیوئی سے فلسفہ تعلیم میں ترقی پسند تحریک (PROGRESSIV MOVEMENT) کی ابتداء ہوتی ہے جو 1960ء تک پورے مغرب میں غالب رہی۔ارتقاء کو ترقی کا راز سمجھنے والے یورپی مفکرین کے ہاں بجائے خود ڈیوئی اور اس کے بعد کے مفکرین تنقیدات کا نشانہ بنتے رہے، کبھی اس تحریک کا حلِ مسئلہ معروضہ (PROBLEM SOLVING APPROACH) اور کرنے سے سیکھنا (LEARN BY DOING) تنقید کا نشانہ بنا اور کبھی پیاژے کا عمروں میں مراتب (STAGES) کا نظریہ ہدف تنقید بنا۔ پھر پاؤلوفریرے جو ''مظلوموں کا فن تدریس'' (PEDAGOGY OF THE OPPRESSED) جیسی شہرۂ آفاق کتاب کا مصنف ہے، فلسفہ تعلیم کے میدان میں قدم رکھتا ہے، پاؤلوفریرے سے پہلے بیسویں صدی تک کے تمام مفکرین یہ کھوج تو لگاتے رہے کہ متعلم کی ذہنی نشوونما کس طرح ہوتی ہے، وہ سیکھتا کیسے ہے۔ مقصد یہ کھوج لگانا تھا کہ متعلم کو کس طرح پڑھایا جائے۔البتہ جون ڈیوئی اور جیرم برونر کی یہ فکر بھی رہی کہ تعلیم کو کس طرح ڈھالا جائے کہ وہ بہتر شہری پیدا کر سکے۔مگر ان دو حضرات کے نظریات میں گہرائی کا فقدان ہے۔مثلاً حل مسئلہ معروضہ کا نظریہ اپنے تئیں درست ہے مگر وہ مسائل کیسے ہوں۔بہت معمولی مسائل کا تذکرہ ان مفکرین کے ہاں ملتا ہے مگر دُنیا جن بڑے مسائل سے دوچار ہے جیسے غربت کیسے ختم کی جائے؟ ناانصافی کا خاتمہ کیسے ہو؟ اور بے چارگی کے مسئلے کا کیا حل ہو؟ اس کا تذکرہ ان کے ہاں نہیں

*اسسٹنٹ پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سینٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان۔

ملتا۔ پاؤلوفریرے ان عظیم الشان مسائل کے حل کو فلسفۂ تعلیم میں داخل کرنے کے لئے تنقیدی شعور سازی کا پروگرام لے کر سامنے آیا۔ وہ اس فلسفۂ تعلیم سے ایسے شہری پیدا کرنا چاہتا ہے جو مروجہ ظلم وستم پر مبنی معاشرہ کی جگہ ایک بہتر انسانیت پرور معاشرہ کی بنیاد رکھ سکیں۔(۱)

اس تمام تر تمہید سے مقصود یہ ہے کہ ارتقاء کی منازل طے کرتے ہوئے مقاصد تعلیم میں بالآخر سب سے اعلیٰ وارفع مقصد یہی ٹھہرا کہ اچھے شہری پیدا کیے جائیں۔

اسلام کا نظریہ تعلیم وتربیت:

اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے اس نے تعلیم کا جو مقصد متعین کیا ہے وہ ان سب مقاصد سے بالاتر، اعلیٰ وارفع ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی وجودیات (ONTOLOGY) یہ ہیں کہ وجود مطلق صرف ذات خداوندی کو حاصل ہے۔ باقی ہر شے وجود میں اس کی محتاج ہے۔ اس کی علمیات (EPISTEMOLOGY) یہ ہیں کہ علم لامحدود صرف ذات خداوندی کو حاصل ہے اور علم قطعی کا ماخذ صرف اور صرف وحی ہے۔ وجدان واحساس صرف ثانوی، غیر قطعی اور ظنی ماخذ ہیں۔ اس کی کونیات (COSMOLOGY) یہ ہیں کہ اس کائنات کو ذات خداوندی نے تن تنہا وجود دیا ہے۔ اس کی قدریات (EXIOLOGY) یہ ہیں کہ عقائد سے اقدار کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اقدار اضافی (RELATIVE) نہیں بلکہ خیر وہ ہے جسے خداوند قدوس نے خیر قرار دیا ہو اور شر وہ ہے جسے خداوند قدوس نے شر قرار دیا ہو۔(۲)

سو جب منظم فلسفہ کی چاروں شاخیں اسلامی تعلیمات کے مطابق خدائے کریم تک منتہی ہوتی ہیں تو پھر خواہ وسائل و ذرائع شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے کیسے ہی کیوں نہ اختیار کیے جائیں، اسلام میں تعلیم کا مقصد ''خدا کا اطاعت گزار صالح بندہ بنانا ہے''۔ خدا کا صالح بندہ وہ ہے جو حقوق النفس، حقوق الحق سبحانہ وتعالیٰ اور حقوق العباد کا ادا کرنے والا ہے۔(۳)

اب اگر غور کیا جائے تو مغربی دانشور دور نشأۃ ثانیہ سے دور جدید تک مختلف ادوار میں فلسفۂ تعلیم کے تحت تعلیم کے جو مقاصد بیان کرتے رہے ہیں وہ سب عقیدۂ صحیحہ کی پختگی جیسے کلیدی مقصد سے محروم رہنے کے باعث کارآمد نہیں۔ کہیں تعلیم برائے معلومات، کہیں تعلیم برائے معاش، کہیں تعلیم برائے معاشرہ جیسے مقاصد پیش کیے جاتے رہے ہیں مگر کہیں بھی تعلیم برائے انسانیت کا تذکرہ نہیں۔(۴)

اسلام اسی تعلیم برائے انسانیت کا داعی ہے۔ جس میں مقدم الذکر نفس، شعور اور عقل کی ایسی تربیت ہے جو عقائد صحیحہ پیدا کرتی ہے۔ عبادات اور معاملات میں ایسی تربیت ہے جو حقوق الحق سبحانہ وتعالیٰ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے ہوشیار کرتی ہے۔

مناسب ہوگا کہ اسلام کے منہج تربیت کے ذکر سے پہلے تربیت کے مبادیات اور تعلیم کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کی اہمیت بیان کردی جائے۔

تربیت۔۔۔مبادیات واہمیت:

تربیت عربی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل ''ربی'' ہے، اسی مادہ سے خدائے کریم کا نام نامی ''رب'' ماخوذ ہے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے:

"الرب فی الاصل التربیة وھو انشاء الشیء حالاً فحالاً الی حد التمام" (۵)

یعنی لفظ رب کی اصل تربیت ہے اور وہ کسی چیز کو حال بہ حال، مرحلہ بہ مرحلہ ایسے نمو دینا ہے کہ بالآخر وہ کمال کو پہنچ جائے۔ اسی معنی میں قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ:

﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ (۶)

جس کا معنی یہ ہے کہ کسی بشر کے لیے یہ مناسب نہیں کہ نبوت، کتاب وحکمت کے ملنے کے بعد وہ خود کو خدا اور الٰہ بنالے اور لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دے بلکہ اسے وحی کی تعلیم وتعلم کے باعث ''ربانی'' ہونا چاہیے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما ''ربانی'' کا معنی یہ بتلاتے ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جو تعلیم میں ایسا حکیمانہ طرز اختیار کرتا ہے کہ اولاً آسان اور چھوٹی چیزوں کی تعلیم دیتا ہے اور جب متعلم انہیں سیکھ لیتا ہے تو بعد ازاں مشکل اور بڑی چیزوں کی تعلیم دیتا ہے گویا جزئیات سکھلاتا ہوا کلیات تک پہنچتا ہے۔ (۷)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح مولائے کریم اپنی صفت خلق اور تعلیم میں رب ہیں، اسی نسبت سے انہوں نے اپنے پیامبروں اور رسولوں کو تعلیم میں ربانی ہونے کا حکم دیا ہے، گویا یہ تربیت ایسا وصف ہے جو خود اولاً خالق کائنات میں موجود ہے اور پھر ثانیاً وہ مخلوق میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ سید قطب تو خدائے کریم کی ساری نازل کردہ شریعت کو تربیت کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔

"والتربیة والتشریع فی المنھج الاسلامی متلازمان او متداخلان او متکاملان" (۸)

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا تلازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے کتاب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انبیاء کے وظائف میں شامل کیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۹)

یہ تزکیہ اخلاقی تربیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''تزکیہ کو تعلیم سے جُدا کر کے مستقل مقصد رسالت اور رسول کا فرض منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اصلاح نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربی کے زیر نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھانا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا ہی کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے اور ہمت کا نسخہ بجز اہل ہمت کی

محبت اور اطاعت کے علاوہ کچھ نہیں۔''(۱۰)

تربیت کے اس ایجابی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا ایک سلبی پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح اچھی تربیت اقدار کو سنوار دیتی ہے اسی طرح بری تربیت اقدار کو بگاڑتی ہے اور پھر یہ بگاڑ پھیلتا ہوا پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر بددعا میں اسی امر کو پیش نظر رکھا تھا:

﴿إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ (۱۱)

''اے رب ان ظالموں کو اگر آپ نے بلا عذاب چھوڑ دیا تو نہ صرف یہ کہ یہ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے بلکہ ان کی بری صحبت وتربیت ان کے ہاں فطرت اسلام پر پیدا ہونے والی اولاد کو بھی برا بنا دے گی۔''

قرون اولیٰ میں تربیت کی اسی اہمیت کے پیش نظر تعلیم کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کیا جاتا تھا جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی اہتمام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں معلم کی بجائے مؤدب کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ عبداللہ ابن مبارک فرماتے ہیں:

"تعلمنا الادب ثلاثین عاما و العلم عشرین عاماً" (۱۲)

''ہم نے علم تو بیس سال میں سیکھا مگر اس علم پر عمل کی تربیت میں تیس سال لگ گئے۔''

نیز رب کریم نے والدین کے لئے دعا کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی حکمت بھی یہی بتلائی گئی ہے کہ وہ بچپن ہی سے اولاد کی تربیت کرتے تھے:

﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا﴾ (۱۳)

اس کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے تربیت میں جس قدر محنت ومشقت اٹھائی ہو وہ اس قدر دعا کا مستحق ہے۔(۱۴)

رسالت مآب ﷺ نے اس شخص کو دو اجروں کا مستحق ٹھہرایا ہے جو کسی باندی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیتا ہے اور اسے آداب زندگی کی تربیت دیتا ہے۔(۱۵) نیز آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو جنت میں اپنی معیت کی بشارت سنائی ہے جو دو بچیوں کی اچھی تربیت کرتا ہے اور پھر ان کا نکاح کر دیتا ہے۔ ان افراد کو یہ اجر اسی تربیت کے باعث مل رہے ہیں۔(۱۶)

تربیت کی اہمیت وفضیلت اسی لیے ہے کہ یہ تعلیم کے ساتھ متلازم ہے۔ اگر انسان کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ تربیت دینے کے عمل کو خارج کر دیا جائے تو انسان میکانکی طور پر کمپیوٹر کی طرح معلومات تو جمع کر لے گا لیکن بہترین اور مثبت معاشرتی اور قدری صلاحیتوں نیز روحانی اور اخلاقی اوصاف سے عاری رہے گا۔ یہ معلومات اس کی ذات کی تشکیل میں کوئی کردار ادا نہیں کریں گی۔ ان حالات میں انسان کا کردار ایک روبوٹ سے مختلف نہیں ہوگا۔

تربیت کی یہ اہمیت صرف مذہبی یا اخلاقی تعلیم ہی کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ فنون کے لیے بھی از حد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر دور میں اہل شرق وغرب ٹریننگ کی اہمیت سے نہ صرف واقف ہوئے ہیں بلکہ تربیتی اداروں (TRAINING INSTITUTES) کا جال بچھانے میں مصروف ہیں۔ ہاں یہ بات مسلم ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم میں تربیت کی اہمیت مزید

بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ وہاں یہی عنصر افراد معاشرہ کی روح کو جلا بخشتا ہے اور ان کے معاملات کو صحیح رخ پر لا کر انہیں خدا کا صالح بندہ بناتا ہے۔

مذہبی اور اخلاقی تربیت میں تعلیم، تمرین اور نمونہ کی پیروی اہم عناصر ہیں۔

"التربية ملكة تحصل بالتعليم والتمرين والقدوة والاقتباس" (۱۷)

دوسری طرف والدین، اساتذہ اور معاشرہ افراد کی اچھی اور بُری تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انسان پیدائش سے موت تک تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔

"التربية تربية الجسم وحده الى سنتين هى وظيفة الام او الحاضنة، ثم تضاف اليها تربية النفس الى السابعة وهى وظيفة الأبوين والعائلة معاً، ثم تضاف اليها تربية العقل الى البلوغ، وهى وظيفة المعلمين والمدارس، ثم تأتى تربية القدوة بالاقربين والخلطاء الى الزواج، وهى وظيفة الصدفة، ثم تاتى تربية المقارنة، وهى وظيفة الزوجين الى الموت او الفرق" (۱۸)

یعنی پیدائش کے بعد دو سال تک صرف جسم کی تربیت ہوتی ہے اور یہ ماں کے ذمہ ہے، پھر سات سال تک جو نفس کی تربیت ہوتی ہے وہ والدین اور کنبہ کے ذمہ ہے، پھر بلوغ تک عقل تربیت پاتی ہے جو معلمین کے ذمہ ہے، پھر اپنے بڑوں کے افعال واعمال سے تربیت پانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو نکاح تک جاری رہتا ہے اور پھر اپنے اقران واماثل کے افعال سے تربیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو موت تک جاری رہتا ہے۔

اسلام کا منہج تربیت:

اسلام تربیت کے باب میں ایک خاص نظام رکھتا ہے جو یقیناً دوسرے مذاہب سے ممتاز ومنفرد ہے پھر اسی خاص نظام کے لئے وسائل وذرائع اور ان کا استعمال بھی منفرد ہے اور اس نظام کی خصوصیات ونتائج بھی منفرد ہیں۔

اسلام انسانی تربیت کے باب میں روح، عقل اور جسم کو ایک دوسرے سے جُدا کر کے ان کی تربیت کا قائل نہیں ہے، وہ جسمِ انسانی کو ایک اکائی سمجھتا ہے جس میں یہ تینوں ایک دوسرے سے باہم اس طرح مربوط ہیں کہ ہر ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ نہ جسم اس قابل ہے کہ اس کی پرستش کو مقصد حیات بنالیا جائے اور نہ عقل ایسی بھروسہ کی چیز ہے کہ اسے دیوتا تسلیم کرلیا جائے اور نہ ہی روح ایسی چیز ہے کہ روحانی پہلو کو غیر معمولی اہمیت دے کر رہبانیت اختیار کر لی جائے۔ اسلام تو ان تینوں سے ایسے کام لینا چاہتا ہے کہ یہ عبادت رب میں مدد ومعاون رہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان کے مادی، روحانی یا جسمانی پہلو میں سے کسی ایک کو ایسے اُبھارا جائے کہ باقی پہلو نظر انداز ہو جائیں تو وہ لازماً انسان کے لاشعور میں اتر جائیں گے، (REPRESSED) ختم نہ ہوں گے اور وقتاً فوقتاً لاشعور سے شعور کے درجہ میں آکر اضطراب پیدا کریں گے۔ انسان کی حیوانی اور جسمانی قوت کو خدائے رزاق کے ارض کائنات پر پھیلے ہوئے خزائن رزق کی تلاش میں صرف ہونا چاہیے۔ اس کی روحانی قوت معرفت الٰہی کے حصول میں خرچ ہونی چاہیے اور اس کی عقلی قوت اس کے اپنے نفس اور کائنات میں خدائے کریم کے

پھیلائے ہوئے اصولوں کو سمجھنے میں لگنی چاہیے۔ یہی چیز اس کی واقعی اور عملی زندگی (ACTUAL AND PRACTICAL LIFE) میں ایک توازن (EQULIBRIUM) پیدا کرتی ہے۔

روح چونکہ عقل اور جسم پر اس لحاظ سے ایک گونہ فضیلت رکھتی ہے کہ محسوسات ومغیبات کے ساتھ تعلق قائم کر لیتی ہے، اسی لیے اسلام نے اس کی پاکیزگی کو اولین ترجیح دی ہے اور خالقِ کائنات کی صفات خالقیت، مالکیت اور قدرت کا تعارف کروا کر اسے اپنے رب کے ساتھ تعلق کی ترغیب دی ہے اور عبادت کا ایسا مرتبہ حاصل کرنے کا شوق دلایا ہے جس میں یہ انسان محسوس کر سکے کہ یہ خدائے عزوجل کو دیکھ رہا ہے۔(۱۹) بلاشبہ یہ روح کی تربیت میں اسلام کا کارنامہ ہے۔

جہاں تک عقل کی تربیت کا تعلق ہے تو اس باب میں اسلام کی اولین تعلیم یہ ہے کہ عقل کو شتر بے مہار مت چھوڑا جائے بلکہ اس کا دائرہ کار متعین اور محدود کر دیا جائے۔ خالق کائنات کی ذات کی حقیقت اس کے احاطے سے باہر ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو تاکید کی کہ خدا کی صفات پر غور کیا کرو مگر اس کی ذات پر غور نہ کرو کہ وہ وراء الوراء ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب شیطان تمہارے دل میں یہ وسوسہ ڈالے کہ تمہارا خالق تو اللہ ہے اور اللہ کا خالق کون ہے تو تم کہو اٰمَنْتُ بِاللّٰہ یعنی میں اللہ پر ایمان لے آیا (اس کی ذات کی حقیقت کو سمجھے بغیر)۔(۲۰)

عقل کو ایک وظیفہ یہ سونپا گیا ہے کہ وہ تاریخی مراحل میں اقوام میں جاری سنت اللہ پر غور کرے:

﴿ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (۲۱)

پھر اسے چاہیے کہ شریعت کے اوامر ونواہی کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غور کرے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (۲۲)

اور پھر انسان کو چاہیے کہ اس عقلی قوت کو سامان زیست کی فراہمی میں کھپائے:

﴿وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ﴾ (۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی اور جسم انسانی میں گہرا ربط وتعلق ہے اس لئے کہ نفس جسم پر اثر انداز ہوتا ہے اور جسم نفس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام جسمانی حرکتیں چلنا، بیٹھنا، چھونا، نفس کے زیر اثر انجام پاتی ہیں۔ اسلام نے اولاً جسم کو ایسا برا اور گندہ تصور نہیں کیا جو نظافت کے لائق اور قابل ہی نہ ہو بلکہ اس نے اس کی تطہیر ونظافت کا مکمل اہتمام کیا ہے اور پورے کے پورے جسدِ انسانی کو حقوق کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

"وان لجسدك عليك حقاً" (۲۴)

نیز آپؐ نے تیراندازی، گھڑسواری، دوڑ لگانے اور تیرنے کی تعلیم کا جو حکم دیا ہے وہ اسی وجہ سے کیا ہے۔ پھر اسی جسد انسانی کی ایک خاص ودیعت شدہ خواہش یعنی جنسی خواہش کی اسلام حوصلہ شکنی نہیں کرتا بلکہ رسالت مآب ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو سمجھایا کہ جائز طریقے سے جنسی خواہش پورا کرنے پر اجر وثواب ہے۔(۲۵) قرآن نے کامیاب مومنین کی ایک خصوصیت یہی

بتلائی ہے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ..... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ (۲۶)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم انسانی کے یہ حقوق یا تو خود فرد کی ذات کا تحفظ کرتے ہیں یا نوع انسانی کے تحفظ کے کفیل ہیں۔ البتہ ان میں اسراف کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اس لیے کہ یہ مقصود نہیں بلکہ مقصود کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ نفس انسانی میں پیدا ہونے والی خواہشات کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انہیں کچلا (REPRESSED) نہ جائے بلکہ رفعت (SUBLIMATION) کے لیے استعمال کیا جائے کیونکہ قلب بھی جسم انسانی کا ایک حصہ ہے، اس کی اصلاح وتربیت کے لیے اسلام اسے خشیت وخوف الٰہی کا مسکن بناتا ہے۔ گویا اسلام بیک وقت روح، عقل، بدن اور نفس کی تربیت فطرت کے مطابق کرتا ہے۔(۲۷)

اس تفصیل سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام ان عناصر ثلاثہ (روح، عقل، جسم) کی تربیت میں کیا منہج اختیار کرتا ہے وہاں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اگر تربیت کا یہ سامان ان عناصر کو فراہم نہ کیا جائے تو بے ربطگی اور بے اعتدالی کا کیسا طوفان اُمڈ آئے جس میں نسل انسانی اپنی عزت وتکریم کھو کر احسن تقویم سے اسفل السافلین میں جا گرے۔

تعلیم وتربیت میں ہم آہنگی:

فرد کا کردار:

تربیت کا سب سے اعلیٰ و برتر ذریعہ شخصیت ہوا کرتی ہے وہ شخصیت خواہ والدین کی شکل میں ہو، خواہ مربی ومعلم کی صورت میں ہو یا اقران واماثل، اقرباء واعزاء اور عام افراد معاشرہ کی تمثیل میں جلوہ گر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مبین نے اپنے فصیح اسلوب خطاب میں رسالت مآب ﷺ کو بہترین اور کامل اسوہ قرار دیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲۸)

قرآن مبین کے اس ارشاد میں جہاں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نبی اکرم ﷺ بہترین نمونہ اور قدوۃ ہیں وہاں اس نقطہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سنۃ اللہ یہی جاری ہے کہ ایک طرف وحی متلو کے ذریعے ہدایت ورہنمائی کا سامان خالق کائنات کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور دوسری طرف اسی ہدایت کی عملی شکل نبی کے وجود کی صورت میں نمودار ہوتی ہے نیز یہ کہ اسوہ اور پیروی کے ذریعہ حاصل ہونے والی تربیت باقی تمام ذرائع کی نسبت قوی تر اور مؤثر ہوتی ہے۔

فرد معاشرہ کی اکائی ہے۔ معاشرے افراد ہی سے بنتے اور سنورتے ہیں۔ اہل منطق کے بقول فرد دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ دوسرے افراد معاشرہ پر اپنا اثر ڈال رہا ہوتا ہے یا پھر دیگر افراد معاشرہ سے متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔ فرد کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام اصلاح وتربیت کی ابتداء انہی سے کرتا ہے۔ یہی افراد معاشرہ والدین کی صورت میں نومولود کے لئے اس قدر اہمیت کے حامل ہیں کہ ایمان وکفر جیسے کلیدی مسئلہ میں وہی سبب بنتے ہیں۔

"کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یهودانه او ینصرانه او یمجسانه" (۲۹)

مسئولیت رعیت کا تصور:

مسئولیت رعیت کا فلسفہ یہی ہے کہ ہر راعی اپنے ماتحتوں کے افعال واعمال پر اسی طرح نظر رکھے جس طرح ریوڑ کا راعی نظر رکھتا ہے۔ جس طرح وہ ان کی حفاظت کرتا ہوا ان کو سیدھی راہ پر لے جاتا ہے اسی طرح راعی انسانیت کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی تربیت اس طرح سے کرے کہ اولاً وہ خیر وشر میں تمیز کرنے والے ہوں اور ثانیاً وہ مستقل راہِ خیر کو اپنانے والے ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیته، الامام راعٍ ومسئول عن رعیته والرجل راعٍ فی اهله وهو مسئول عن رعیته والمرأة راعیة فی بیت زوجها ومسئولة عن رعیتها" (۳۰)

مقام تفکر وتدبر ہے کہ جب خلیفۂ وقت اجتماعی سطح پر اور مرد وعورت کنبہ کی سطح پر مسئولیت کے خوف سے ماتحت افراد کی تربیت کر کے انہیں سیدھے راستے پر لگا رہے ہوں تو تعلیم وتربیت میں کیسی ہم آہنگی اور موافقت کی فضا پیدا ہوگی۔

والدین کے لئے بچوں کی تربیت ہر دور میں ایک اہم مسئلہ رہا ہے اور خصوصاً آج کے دور میں، جب کہ میڈیا کے ذریعے ان کے اخلاق واعمال پر غیر محسوس طریقے سے اثرات پڑ رہے ہیں، اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر مسئولیت کے اس مذکورہ بالا فرض کی صحیح ادائیگی والدین کی طرف سے شروع ہو جائے تو معاملات کافی حد تک درست ہو سکتے ہیں۔ جس حدیث میں بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کی ادائیگی کا اور دس سال کی عمر میں عدم ادائیگی پر سرزنش وسزا کا حکم ہے، (۳۱) اس میں اشارۃً یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ والدین ان کے افعال واعمال میں ایک خاص حد تک ذمہ دار ہیں۔ (۳۲)

بچوں کو قدم قدم پر تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی تربیت آئندہ زندگی کے ہر ہر قدم پر ان کی معاون ہوتی ہے۔ عمر بن ابی سلمہؓ رسول مقبول ﷺ کی زیر تربیت تھے، چونکہ بچے تھے اس لئے کھانے کے آداب سے واقف نہ تھے، پلیٹ میں سے ہر جگہ سے لقمہ لے لیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے فرمایا "یا غلام سم الله، وکل بیمینك وکل مما یلیك" (۳۳) کہ اللہ کا نام لے کر شروع کرو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور ہمیشہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔ اس تربیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ پھر ہمیشہ سے ایسے ہی کھانے کی میری عادت جم گئی۔

معاشرہ کا کردار:

فرد کی تربیت پر معاشرہ بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے کوئی جائے فرار نہیں کہ اسلامی معاشرہ اسلامی تربیت کا مقصود بھی ہے اور اس کا وسیلہ اور ذریعہ بھی ہے۔ تربیت اسلامی کے وسیلہ ہونے کی تشریح تو یہ ہے کہ والدین خواہ بچوں کی تربیت کتنی ہی عمدہ کیوں نہ کرلیں، انہیں بہرحال اپنے بچوں کو معاشرہ کے حوالے کرنا پڑتا ہے اور عام افراد ایسے ابطال (HEROES) نہیں ہوتے کہ وہ بُرے ماحول میں رہ کر برائی کے اثرات قبول نہ کریں۔ فرض کر لیجئے کہ ایک شخص اپنے گھر سے نیکی کی تعلیم حاصل کر کے نکلا ہے مگر معاشرے میں اسے جبر واستبداد کی حکمرانی، شر کی بادشاہت اور برائی کا غلبہ ملتا ہے۔ کیا ایسی

صورت میں وہ گھر سے حاصل ہونے والی نیکی کی تعلیم پر عمل کر سکے گا؟ اور اگر کر سکے گا تو کس حد تک اور کب تک؟۔(۳۴)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا نظام:

اب ایسی صورت میں فطری قاعدہ یہی ہے کہ معاشرے کے ہر ہر فرد کو ایک خاص حد تک اس مجموعی روش کا ذمہ دار بنا دیا جائے۔ظاہر ہے کہ یہی ایک ایسا معتدل طریقہ ہے جس سے ہر شخص معاشرے کی اصلاح اور اس کے جادۂ مستقیم پر قائم رہنے میں اپنا حصہ ڈال سکتا ہے۔

قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اسے وصیت حق سے تعبیر کیا:

﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾(۳۵)

رسالت مآب ﷺ نے اس کی عملی صورت اس طرح بیان فرمائی ہے:

"من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلك أضعف الایمان" (۳۶)

یعنی جب بھی تم میں سے کوئی کسی ایسے امر کو دیکھے جو شریعت کی نگاہ میں گناہ ہے تو اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اُسے برا کہے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اسے بُرا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اگر افراد معاشرہ اجتماعیت کے احساس سے لبریز ہو کر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیں تو والدین اور اساتذہ کی کاوشوں کو مہمیز لگ جائے اور تعلیم وتربیت میں ہم آہنگی کے سامان پیدا ہونا شروع ہو جائیں۔(۳۷)

معلم کا بنیادی کردار:

مقالہ نگار نے تعلیم وتربیت میں ہم آہنگی کے باب میں معلم کے کردار کو قصداً ابھی تک بیان نہیں کیا، اس کی دو وجوہات ہیں۔اول یہ کہ تعلیم وتربیت اور اس کے متعلقات کا جب تذکرہ ہوتا ہے، ذہن فوراً معلم اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس باب میں والدین اور معاشرہ کی ذمہ داریاں بھی کچھ کم نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ معلم کیسے ایک مؤثر مربی بن سکتا ہے، یہ سوال تفصیلی جواب کا متقاضی ہے، جس کے لیے شاید مقالہ کا یہ حصہ ہی مناسب اور موزوں ہے۔

اساتذہ کسی بھی معاشرے کا سب سے حساس اور اہم طبقہ ہوتے ہیں، وہ معاشرہ کو قائدین فراہم کرتے ہیں۔مفکرین، ماہرین اور مختلف شعبوں کے متخصصین انہی کے سامنے زانوائے تلمذ طے کر کے ان مقامات پر پہنچتے ہیں۔اخلاقی اور مذہبی تعلیم میں تو اساتذہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔اس اہمیت کے ایجابی وسلبی دونوں پہلو ہیں۔ایجابی پہلو کے متعلق تو محض اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ وہ انبیاء کے وارث ہیں، البتہ سلبی پہلو قدرے تفصیل کا متقاضی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ﴾ (۳۸)

کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ان اہل کتاب کو ان کے علمائے ربانیین نے گناہ والی بات کہنے سے اور مال حرام کھانے سے منع

کیا۔ یہ کہہ کر قرآن نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ معاشرے کی عمومی روش کے ذمہ دار معلمین ہیں۔ یہی معلمین حکمت و دانائی سے انہیں شرک اور ظلمات معاصی سے بچا سکتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اپنی امت پر آنے والے ایک ایسے دور کا تذکرہ کیا ہے جس میں مساجد ویران ہو جائیں گی، اسلام برائے نام ہوگا اور قرآن کے الفاظ ہی رہ جائیں گے۔ (عمل نظر نہ آئے گا) اس موقع پر آسمان کی چھت کے نیچے سب سے بُری مخلوق علماء ہوں گے۔ (۳۹) اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مذہب و اخلاق کے معلمین جب اخلاص سے عاری ہو جائیں اور اُن کی تعلیم میں عمل (جو معاشرے کی تربیت کا سبب ہے) کا فقدان ہو جائے تو یہی وقت زوال امت کا وقت ہے۔ اس لیے اسلامی تعلیم کے مقصد اول ''صالح انسان کی تیاری'' میں معلمین کا کردار کلیدی اور اوّلی ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی توقعات انہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

مؤثر طریقہ ہائے تدریس:

خالق کائنات نے معلم انسانیت کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ وہ تند خو اور درشت مزاج نہ تھے بلکہ نرم خو اور نرم مزاج تھے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۴۰)

معلم کی تعلیم میں مؤثر طریقہ تدریس کامیابی کے امکانات کو بڑھا دیتا ہے۔ اختصار و جامعیت کی حامل تدریجی تعلیم، جب آسان الفاظ میں، خوش مزاج اور خوش روئی کے ساتھ دی جائے اور ذہن کے دریچے کھولنے کے لیے اور فکری پرورش کے لئے سوال کی عام اجازت دی جائے اور انعام، حوصلہ افزائی اور تعریف و توصیف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ علم قلوب و اذہان کی تہوں میں نہ اترے۔ (۴۱)

لیکن اصل سوال اس سے بھی آگے کا ہے۔ وہ کون سے وسائل اور ذرائع ہیں جنہیں اختیار کر کے اس تعلیم کو تربیت کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ تعلیم و تربیت میں ہم آہنگی خود تعلیم کے مقاصد میں شامل ہے۔

عملیت مربی:

عمل کی قوت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ قرون اولیٰ میں جہاں علم کی آفت نسیان کو سمجھا جاتا تھا، وہاں علم کا وبال بے عملی کو تصور کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی قرأت سیکھنا بلاشبہ عظیم کارِ ثواب ہے مگر ابن مسعودؓ کا قول ہے:

"انزل القرآن ليعمل به فاتخذتم دراسته عملاً" (۴۲)

کہ قرآن تو عمل کرنے کے لئے نازل ہوا تھا، تمہیں کیا ہوا کہ اس کے سیکھنے ہی کو تم نے عمل سمجھ لیا اور اس پر تکیہ کر بیٹھے۔ اب اگر یہی بے عملی خود معلم کی زندگی میں آ جائے تو وہ کیا نتائج پیدا کرے گی۔ کیا اس کے شاگرد اس کی دی ہوئی تعلیم میں دلچسپی لیں گے یا کیا وہ اس تعلیم سے تربیت کی راہ پر گامزن ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ امام غزالی نے درست لکھا ہے:

"ينبغي ان يكون المعلم عاملا بعلمه فلا يكذب قوله فعله لأن العلم يدرك بالبصائر والعمل يدرك بالابصار وارباب الابصار اكثر" (۴۳)

یعنی یہ مناسب نہیں کہ معلم کا عمل اس کے قول (تعلیم) کے منافی ہو، اس لیے کہ علم تو دل کی آنکھ سے حاصل کیا جاتا ہے

اور عمل سر کی آنکھ سے سیکھا جاتا ہے اور سر کی آنکھ رکھنے والے بہر حال زیادہ ہیں۔

معلم کے عمل کی یہی قوت متعلم کو بغیر کسی لمبی چوڑی ترغیب کے عمل کی راہ پر لے آتی ہے۔

یوں تو آنحضورﷺ کی ساری زندگی دائمی اور مسلسل (ON GOING) جدوجہد سے عبارت تھی تاہم صرف وہ امور جن میں ہادی برحقؐ نے جس بات کا حکم دیا اس پر خود عمل کر کے دکھایا، بے شمار ہیں۔ دوسروں کو پانچ فرض نمازیں پڑھنے کا حکم دیا تو خود ان فرائض کی پابندی کے ساتھ ساتھ نفلی نمازیں اشراق، چاشت اور تہجد بھی اہتمام سے پڑھ کے دکھلائیں۔ دوسروں کو انفاق کا حکم دیا تو خود اس کا ایسا عملی نمونہ دکھایا کہ جو گھر میں تھا، سب خرچ کر دیا۔

اس عملیت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ تمام اعمال جن کی ایک مخصوص ظاہری صورت ہے، رسول مقبولﷺ وہ اعمال صحابہ کرامؓ کو کر کے دکھلاتے تھے۔

مالک بن حویرث کہتے ہیں کہ ہم اپنے علاقے سے مدینہ منورہ دین سیکھنے کے لیے آئے۔ چونکہ نوجوان تھے اسلئے بیس دنوں کے بعد گھر کی یاد ستائی، آنحضرتﷺ رحیم و رفیق تھے، سمجھ گئے۔ فرمایا:

"ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم وعلموھم ومروھم..... وصلوا کما رایتمونی اصلی" (۴۴)

یعنی اب تم اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور اپنے اہل وعیال میں رہ کر انہیں دین سکھاؤ، احکام کی تلقین کرو اور جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھتے رہو۔

عملیت مربی ہی کا نتیجہ تھا کہ دین اسلام کے وہ اعمال جو مخصوص شکل و ہیئت رکھتے تھے وہ تواتر کے ساتھ آنحضرتﷺ سے ہم تک پہنچے اور قیامت تک آپﷺ کی امت اسی قدوہ پر عمل کرتی رہے گی۔ (۴۵)

پھر اسی عملیت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ معلم کی شخصیت اگر ایسی ہو کہ وہ زندگی کے عام معمولات میں متعلمین کی نظر سے اوجھل ہو تو اس کی تعلیم تربیت کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی۔ عثمان بن عفانؓ نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے کہا:

"انا واللہ قد صحبنا رسول اللہ ﷺ فی السفر والحضر، وکان یعود مرضانا، ویتبع جنائزنا، ویغزو معنا ویواسینا بالقلیل والکثیر" (۴۶)

یعنی آنحضرتﷺ عام فرد کی طرح اپنے معمولات زندگی میں ہمارے ساتھ شرکت کرتے تھے، وہ ہمارے مریضوں کی عیادت کرتے تھے، جنازوں میں شریک ہوتے تھے، غزوات میں ہمارے ساتھ ہوتے تھے اور قلیل و کثیر کے ساتھ ہماری مواسات کرتے تھے۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات قابل مثال ہے کہ نبی مکرمﷺ مختلف مواقع پر صحابہ کرام کے ساتھ مل جل کر کام کرتے تھے، غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کی تعمیر میں بنفس نفیس خود شریک ہوئے۔

زیر تربیت افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا:

مربی کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ زیر تعلیم و تربیت افراد کی حرکات وسکنات اور اقوال وافعال غرض ہر طرح کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔

اگر مربی، معاشرے کا جیتا جاگتا فرد ہے تو پھر مربی کے سامنے افراد کے ذاتی واجتماعی اعمال کا ملاحظہ کوئی مشکل بات نہیں۔ عملی زندگی کے یہی واقعات، تربیت کا سنہرا موقع ہوتے ہیں۔ رسالت مآب ﷺ اس ذریعہ تربیت کو بھرپور طور پر استعمال فرماتے تھے۔ زیرنظر مثالیں اسی دعوی کا ثبوت ہیں۔

۱۔ رسالت مآب ﷺ نے صحابہ کرام کے اس عمل کو دیکھا کہ وہ عرب معاشرے کی روایت کے مطابق راستوں میں بیٹھ کر محو گفتگو ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا۔ صحابہ کرامؓ کے اس عذر پر کہ یہی ہماری مجلسیں ہیں کہ جن میں ہم روزمرہ کے امور پر گفتگو کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ تمہارے لیے ضروری ہیں تو پھر راستوں کا حق ادا کیا کرو۔ وہ حق یہ ہے کہ آنکھ نیچی رکھو، تکلیف نہ دو، سلام کا جواب دو اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو۔ (۴۷)

۲۔ ابن عباس روایت کرتے ہیں:

"ان رسول اللہ ﷺ رأی خاتماً من ذهب فی ید رجلٍ فنزعه فطرحه وقال "یعمد أحدکم الی حجرة من نار فیجعلها فی یده" فقیل للرجل بعد ما ذهب رسول الله ﷺ خذ خاتمك وانتفع به فقال لا واللہ ما اخذه ابداً وقد طرحه رسول الله ﷺ" (۴۸)

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سونے کی انگوٹھی پہنے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے اتار کر پھینک دی اور فرمایا کیا تم میں سے ایک شخص آگ کا انگارہ اپنے ہاتھ میں پہنتا ہے؟ رسالت مآب ﷺ کے وہاں سے تشریف لے جانے کے بعد اس شخص سے کہا گیا کہ انگوٹھی اٹھالو اور اسے اپنے کام میں لے آؤ، اس شخص نے کہا میں ہرگز اس چیز کو کام میں نہ لاؤں گا جسے آپ ﷺ نے پھینک دیا۔

۳۔ عبداللہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسالت مآب ﷺ ہمارے گھر تشریف فرما تھے کہ میری والدہ نے مجھے قریب بلانے کے لیے کہا کہ آؤ میں تمہیں کچھ دوں گی۔ آپؐ نے میری والدہ سے کہا کہ واقعی تمہارا دینے کا ارادہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا! جی ہاں میں اسے کھجور دے دوں گی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اما انك لو لم تعطیه شیئا کتبت علیك کذبة'' (۴۹) کہ اگر تم اس کے قریب آنے پر اسے کچھ نہ دو تو یہ بھی ایک جھوٹ ہوگا جو تمہارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

مقامِ فکر ہے کہ کیا مذاح میں جھوٹ کو جھوٹ ہی باور کرانے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع ہوسکتا ہے۔ یقیناً تربیت کے یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جہاں تعلیم کے ساتھ اس کی ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے۔

۴۔ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کو تیراندازی سیکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قبیلہ بنو اسلم کے کچھ لوگوں کو آپ نے دیکھا کہ تیراندازی کا مقابلہ کررہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''ارموا بنی اسماعیل فان اباکم کان رامیاً'' اے بنو اسماعیل! تیراندازی کرو اس لیے کہ تمہارے جد امجد حضرت اسماعیل بھی تیراندازی کرتے تھے اور میں تمہارے اس مقابلہ میں فلاں جماعت کے ساتھ ہوں۔ اس پر دوسری جماعت نے تیراندازی روک دی۔ آپؐ نے پوچھا کہ تم تیر کیوں نہیں چلا رہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم کیسے تیراندازی کریں جب کہ آپ تو دوسری جماعت کے ساتھ مل گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ''ارموا فانا معکم کلکم'' (۵۰) کہ تم تیراندازی جاری رکھو میں تم سب کے ساتھ ہوں۔

یہی وہ کلیدی صفت ہے جو ہر مربی میں موجود ہونا ضروری ہے۔ زیر تربیت افراد کی اخلاقی، معاشرتی، روحانی اور اقتصادی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ مربی ان کے اعمال کی نگرانی کرتا رہے۔

وہ احداث وواقعات جو آئے روز پیش آتے رہتے ہیں ان میں تربیت کے کئی پہلو موجود ہوتے ہیں۔ محسوس کی خُوگر

انسانی طبیعت ان واقعات سے اثر لینے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ اگر کوئی صاحب بصیرت ان واقعات کو اسباق تربیت میں بدلنا چاہے تو عبرت ونصیحت اور تربیت واصلاح کے بے شمار مواقع نکل سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر سبق رسمی تعلیم ہی کے ذریعے دیا جائے بلکہ لیل ونہار میں تماشائے دنیا خود ایک معلم ہے۔ اس طریقۂ تربیت سے سیاست، معاشرت، معیشت حتی کہ عقائد کی اصلاح بڑی سہولت سے ہوسکتی ہے۔ سیاست وجہاں بانی، جو ایک مشکل فن تصور کیا جاتا ہے، تعلیمات نبوی ﷺ سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ وہ بھی احداث وواقعات سے فائدہ اٹھا کے سکھایا جاسکتا ہے۔

۵۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے خلاق قدیر نے اس امت کی رہنمائی کا عظیم کام لینا تھا، انہیں اس مقصد کیلئے ہادی برحق ؐ کے ماتحت مستقل تربیت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ رسالت مآب ﷺ نے مختلف مواقع پر انہی واقعات وحوادث سے تدبیر وسیاست کے کئی اصول انہیں سکھائے۔ (۵۱) مثلاً غزوۂ بنی المصطلق میں عبداللہ بن ابی نے نفاق آمیز کلمات کے ساتھ عصبیت ونفرت کی آگ بھڑکائی۔ اس کے یہ کلمات ''لَئُخرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ'' کہ ہم عزت والے ان ذلت والوں (مسلمانوں) کو مدینہ سے باہر نکال دیں گے، رسالت مآب ﷺ کو حضرت زید بن ارقمؓ نے پہنچا دیے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ کلمات سن کر غصہ سے بھر گئے اور عرض کیا کہ مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آنحضرت ﷺ نے منع فرما دیا اور عبداللہ بن ابی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آئندہ جب بھی یہ رئیس المنافقین آتش نفاق کی آگ بھڑکاتا، اس کے اپنے ہی لوگ اس کو طعن و تشنیع اور زجر وتوبیخ کا نشانہ بناتے۔ آنحضرت ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"کیف تری یا عمر اما واللہ لو قتلته یوم قلت لی لارعدت له انف لا امرتها الیوم بقتله لقتلته" (۵۲)

جس دن تم نے مجھے اس کے قتل کرنے کو کہا تھا اگر میں تمہاری بات تسلیم کر کے اسے قتل کر دیتا تو آج تم پر لرزہ خیز حال پیش آجاتا۔

سیاست وجہانبانی کا یہ سبق کسی درسگاہ میں بیٹھ کر معلم سے رسمی تعلیم کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ تو مربی کی تربیت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

خاتمۂ بحث:

رسالت مآب ﷺ کا دائرہ تربیت کسی خاص گروہ، جماعت یا پیشہ کے افراد تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں عوام وخواص، غنی و فقیر، عالم وجاہل سب شامل تھے۔ نیز اسلام کی تعلیمات جس میں عقائد وعبادات سے معاشرت واخلاق تک کے تمام شعبے شامل ہیں، ان میں سے ہر شعبہ کے متعلق اسباق تربیت لیتے ہوئے، ہر ایک فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق رحمۃ للعالمین ﷺ کے چشمہ صافی سے سیراب ہو رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ امت کو آج تعلیم سے زیادہ تربیت اور تعداد افراد سے زیادہ تنظیم افراد کی ضرورت ہے۔ افراد مل کر ہجوم بن جاتے ہیں اور ہجوم تربیت کے ذریعے اقوام وملل میں ڈھل جاتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ہم آہنگی خود بخود صالح قیادت پیدا کر دیتی ہے۔ معاصر قحط الرجال کا زمانہ کسی مرد قلندر مربی کا منتظر ہے جو امت کی سیم وزر سے کہیں زیادہ قیمتی صلاحیتوں کو ان کے مناسب مواقع پر استعمال کرا سکے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حواشی وحوالہ جات

۱۔ اقبال خان (مؤلف ومقدمہ نگار) جدید تعلیمی فلسفہ، جون ڈیوئی سے پاؤلوفریرے تک، اقبال خان، تعلیمی فلسفے کا ارتقاء، لاہور، ادارہ تخلیقات، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۔۴۳

۲۔ موسیٰ خان جلالزی (مؤلف) تاریخ وفلسفہ تعلیم وتربیت، بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، اسلام کا فلسفۂ تعلیم، لاہور، مجید بک ڈپو، ۱۹۹۲ء، ص ۳۹۔۴۳

۳۔ افضل حسین، فن تعلیم وتربیت، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص ۸۱

۴۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۸۔۱۸۸؛ نعیم صدیقی، تعلیم کا تہذیبی نظریہ، لاہور، الفیصل ناشران ۲۰۰۹ء، ص ۲۳۰

۵۔ راغب اصفہانی، الامام، المفردات فی غریب القرآن، بیروت، دار الفکر ۱۴۱۸ھ، ص ۳۳۶

۶۔ القرآن الکریم، آل عمران ۳:۷۹

۷۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح مع فتح الباری، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۰ھ، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ۱/۱۶۰

۸۔ سید قطب، تفسیر فی ظلال القرآن، قاہرہ، دار الشروق، ۱۴۱۰ھ، ۲/۱۰۴

۹۔ القرآن، آل عمران ۳:۱۴۶

۱۰۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۷۶ء، ۱/۳۳۹۔۳۴۰

۱۱۔ القرآن، نوح ۷۱:۲۷

۱۲۔ عبداللہ بن المبارک، الامام، الجہاد، جدہ، دار المطبوعات الحدیثۃ، ص ۳۸

۱۳۔ القرآن، الاسراء ۱۷:۲۴

۱۴۔ سعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر، تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان، بیروت، موسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۰ھ، ص ۴۵۶

۱۵۔ قشیری، مسلم بن الحجاج، الجامع الصحیح، بیروت، دار الجیل، ۱۴۰۵ھ، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد ﷺ، ۱/۹۳، ح ۴۰۴

۱۶۔ الجامع الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات، ۸/۳۸، ح ۶۸۶۴

۱۷۔ کواکبی، عبدالرحمٰن، الرحالۃ کطبائع الاستبداد ومصارع الاستعباد، قاہرہ، دار البشار، ۱۳۹۸ھ، ۱/۱۳۳

۱۸۔ ایضاً، ۱/۱۱۲

۱۹۔ الجامع الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب معرفۃ الایمان۔۔۔۔۔، ۱/۲۸، ح ۱۰۲

۲۰۔ احمد بن حنبل، الامام، المسند، قاہرہ، موسسۃ قرطبۃ، س۔ن، حدیث خزیمۃ بن ثابت، ۵/۲۱۴، ح ۲۱۹۱۶

۲۱۔ القرآن، آل عمران ۳:۱۳۷، ۱۳۸

۲۲۔ القرآن، البقرۃ ۲:۱۷۹

۲۳۔ القرآن، الانبیاء، ۲۱:۱۰

۲۴۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب النکاح، باب لزوجک علیک حق، ۹/۲۹۹، ح۵۱۹۹

۲۵۔ الجامع الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف، ۳/۸۲، ح۲۳۷۶

۲۶۔ القرآن، المومنون ۲۳:۵، ۶

۲۷۔ الزنتانی، عبدالحمید الصید، فلسفۃ التربیۃ الاسلامیۃ فی القرآن والسنۃ، بیروت، الدار العربیۃ، ۱۹۹۳ء، ص۴۴۶

۲۸۔ القرآن، الاحزاب، ۳۳:۲۱

۲۹۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین، ۳/۲۴۵۔۲۴۶، ح۱۳۸۵

۳۰۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب الجمعۃ، باب الجمعۃ فی القری والمدن، ۲/۳۸۰، ح۸۹۳

۳۱۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، السنن، کتاب الصلوٰۃ، باب متی یومر الغلام بالصلوٰۃ، ۱/۱۸۷، ح۴۹۵

۳۲۔ علوان، تربیۃ الاولاد فی الاسلام، حلب، دار السلام، ۱۹۸۱ء، ۲/۷۲۹

۳۳۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب الاطعمۃ، باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین، ۹/۱۲۸، ح۵۳۷۶

۳۴۔ سید محمد قطب، اسلام کا نظام تربیت (مترجم)، ساجد الرحمٰن صدیقی، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص۳۵۷۔۳۶۰

۳۵۔ القرآن الکریم

۳۶۔ الجامع الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان، ۱/۵۰، ح۱۸۶

۳۷۔ محمد شفیع مفتی، نظام تعلیم وتربیت، ماہنامہ افکار معلم، اگست ۱۹۹۴ء، ص۱۴۔۱۵

۳۸۔ القرآن الکریم، المائدۃ ۵:۶۳

۳۹۔ بیہقی، احمد بن الحسین، شعب الایمان، ریاض، مکتبۃ الرشد، ۲۰۰۳ء، ۲/۳۱۷، ح۱۷۶۳

۴۰۔ القرآن، آل عمران ۳:۱۵۹

۴۱۔ مؤثر طریقہ ہائے تدریس کی یہ مختصر وضاحت دراصل رحمت کائنات ﷺ کے طریقہ تدریس کی خوبیاں ہیں جنہیں مقالہ نگار نے ایجاز واختصار سے اس لیے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ تدریس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس کا اعادہ شاید تکرار کا باعث ہوگا۔ نیز یہ کہ تربیت کہ دو پہلو ہیں، ایک پہلو تو یہ ہے کہ تعلیم دیتے وقت عادات واطوار، اخلاق وافعال اور ان سے بھی بڑھ کر افکار وعقائد کی تربیت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی جائے۔ تربیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہی تعلیم جو اصول وکلیات کی شکل میں دی گئی ہے، جب عملی میدان میں جزئیات وفروعات میں استعمال ہو تو تربیت میں ڈھل جائے۔ ''مؤثر طریقہ ہائے تدریس'' تربیت کے اس مقدم الذکر پہلو کو جلا بخشتے ہیں اور ''عملیت مربی'' اور ''زیر تربیت افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا'' تربیت کے مؤخر الذکر پہلو کو مؤثر بناتے ہیں۔

۴۲۔ الغزالی، محمد بن احمد، احیاء علوم الدین، بیروت، دار الخیر، ۱۴۱۷ھ، ۱/۸۵

۴۳۔ ایضاً، ۱/ ۷۷
۴۴۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین۔۔۔، ۲/ ۱۱۱، ح ۶۳۱
۴۵۔ محمد مخزون، منہج النبی ﷺ فی الدعوۃ من خلال السیرۃ الصحیحہ، ریاض، دار السلام، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۱
۴۶۔ مسند احمد، مسند عثمان بن عفان، ۱/ ۶۹، ح ۵۰۴
۴۷۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب المظالم، باب افنیۃ الدور والجلوس فیہا۔۔۔، ۵/ ۱۱۲، ح ۲۴۶۵
۴۸۔ الجامع الصحیح لمسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب فی طرح خاتم ذھب، ۶/ ۱۴۹، ح ۵۵۹۲
۴۹۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التشدید فی الکذب، ۲/ ۷۱۶، ح ۴۹۹۱
۵۰۔ الجامع الصحیح مع فتح الباری، کتاب الجہاد والسیر، باب التحریض علی الرمی، ۶/ ۹۱، ح ۲۸۹۹
۵۱۔ شاہ ولی اللہ الدہلوی، احمد بن عبد الرحیم، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، (مترجم) مولانا اشتیاق احمد، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س۔ن، ۳/ ۱۶۸
۵۲۔ ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۸ھ، سنۃ ست من الہجرۃ، غزوۃ بنی المصطلق، ۴/ ۱۸۶